ہندوستان میں

# دعوت الی القرآن

## ضرورت، مواقع، طریقہ کار

محمد عنایت اللہ اسد سبحانی

کتاب کا نام: ہندوستان میں دعوت الی القرآن: ضرورت، مواقع، طریقہ کار
مصنف: محمد عنایت اللہ اسد سبحانی
صفحات: 16
سن اشاعت: 2015ء
تعداد: 1000
قیمت: 15-00/روپے
ناشر: **ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس**
F-155، فلیٹ نمبر:204، ہدایت اپارٹمنٹ
شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔110025
فون:09891051676

مطبوعہ: ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرس، دریا گنج، نئی دہلی۔2
ملنے کے دوسرے پتے:

**منشورات پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس**
E-61، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔110025
فون:09810650228

**البلاغ پبلی کیشنز**
N-1، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔110025
فون:09971477664

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمارا ملک ہندوستان، جس کے ذرے ذرے سے ہمیں محبت ہے، جس کے چپے چپے کو ہم نے خون جگر سے سینچا ہے۔ جس کے بارے میں شاعر مشرق نے کہا ہے اور بالکل صحیح کہا ہے:

ہم بلبلیں ہیں اس کی، وہ گلستاں ہمارا

آج ہمارا یہ محبوب ملک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے، ہمارا یہ ملک ہی نہیں آج پوری دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔

یہ تنہا ہمارا احساس نہیں، آج ملک کے دانشور ملک کے بارے میں اور دنیا کے دانشور دنیا کے بارے میں مستقل اس طرح کے بیانات دے رہے ہیں، جو انتہائی تشویشناک ہیں۔

چند بیانات ملاحظہ ہوں:

''ملک میں شاید ہی کوئی ایسا سیکٹر ہو جہاں کرپشن نے اپنے قدم نہ جما لیے ہوں۔ سیاست تو اس میں بری طرح ملوث ہے۔'' (اماندرا سنوال، نئی دہلی۔ راشٹریہ سہارا 18 جولائی 2007ء)

''ہم بحیثیت ایک قوم اور بحیثیت ایک ملک بالکل غلط سمت میں جا رہے ہیں، یہ صورت حال فوری توجہ چاہتی ہے۔'' (ایم کے بجاج، چندی گڑھ دی ہندو 6 جون 2007)

''ہمارے ملک (ہندوستان) میں کرپشن، غربت، جنگلات کے تحفظ اور ماحولیات کو آلودگی سے بچانے کے لیے قوانین موجود ہیں، مگر ان میں سے کتنے قوانین ہیں جو ملک کے مسائل کو حل کر سکے ہیں؟'' (درجت گپتا، بنگلور، انڈین ایکسپریس 15 دسمبر 2007)

اس وقت کی ہماری یہ گفتگو پوری دنیا کے تناظر میں نہیں، بلکہ اپنے ملک ہندوستان کے تناظر میں ہے، اس لیے ہم انہی چند بیانات پر اکتفا کرتے ہیں، جو براہ راست ہمارے ملک سے متعلق ہیں۔

ایک طرف ملک کے یہ حالات ہیں، جن پر رائے زنی کرنے والے مختلف انداز سے رائے زنی کرتے ہیں۔ مختلف سیاسی پارٹیاں اور مختلف سیاسی نیتا ایک دوسرے کو الزام دیتے، اور ایک دوسرے کو

بگاڑ کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔

ایک طبقہ ان لوگوں کا بھی ہے، جو براہ راست ملک کی سیاست میں شریک نہیں ہیں، مگر وہ ان حالات سے بری طرح پریشان ہیں جو ملک کو بہت تیزی سے تباہی کی طرف ڈھکیل رہے ہیں۔ وہ حیران ہیں کہ آخر بگاڑ کا یہ سیلاب کدھر سے آرہا ہے اور اس سیلاب بلا پر بند لگانا کیونکر ممکن ہے؟

دوسری طرف اللہ کی کتاب ہے جو برابر آواز دے رہی ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعاً اِنَّهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔ (سورۃ الزمر:۵۳)

(کہو اے میرے بندو، جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ تمام گناہوں کو معاف کردے گا۔ بلاشبہ وہ بہت ہی معاف کرنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔)

يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوراً مُّبِيْناً۔ (سورۃ النساء:۱۷۴)

(اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کے ہاں سے واضح قانون آگیا، اور تمہاری طرف ہم نے ہر گمرہی کو چھانٹ دینے والا نور اتارا ہے)

گویا انسانی سماج میں جو بھی ظلم و زیادتی اور بدعنوانی ہوتی ہے، وہ دراصل نتیجہ ہوتی ہے اللہ کی نافرمانی کا۔ ثانیاً: اللہ کا بھیجا ہوا قانون اور اس کا بھیجا ہوا نظام ہی ایک اچھی اور پرسکون زندگی کا ضامن ہے۔ اس نظام سے بغاوت کر کے انسان کبھی بھی سکھ نہیں پا سکتا۔

ہمارے مہربان رب کی یہ صدائے دل نواز آج ہندوستان کے گوشے گوشے میں گونج رہی ہے۔ وہیں دوسری جانب ملک کا ذرہ ذرہ آج اللہ کی نافرمانی اور اس کے احکام سے انحراف کے سنگین نتائج سے پناہ مانگ رہا ہے۔ مگر رب کی اس صدائے دل نواز یا ملک کی فریاد الم کو سننے والے کان کہاں سے آئیں؟

بجا طور پر مسلم امت سے یہ توقع کی جاسکتی تھی، کہ وہ اپنے رب کریم کی اس پکار پر کان دھرے گی۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ مسلم قوم کے لیے بھی اس پکار میں کوئی کشش نہیں رہی۔

کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ کی کتاب اور اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہمارے ملکی یا قومی مسائل کو حل نہیں کر سکتی۔

اس حقیقت کی نہایت واضح دلیل ہمارے ماضی وحال کے تجربات ہیں۔ اس ملک میں بسنے والے انسانوں نے اس ملک کی بہبود و ترقی کے لیے جتنے طریقے، جتنے راستے، اور جتنے ازم ہو سکتے



تھے ان سب کا تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے۔ اگر انہوں نے تجربہ نہیں کیا ہے تو صرف اللہ کی کتاب اور اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت کا۔

انسانی تاریخ کی یہ کتنی عجیب اور کتنی اندوہ ناک حقیقت ہے کہ انسان اپنے ہی جیسے بے علم اور کم فہم انسانوں کے بنائے ہوئے اصولوں اور فلسفوں کو تو بڑی آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ وہ ان کا تجربہ کرتا ہے اور ناکام ہوتا ہے، پھر تجربہ کرتا ہے، پھر ناکام ہوتا ہے، بار بار تجربے کرتا ہے اور بار بار ناکام ہوتا ہے، مگر اپنے خالق کے بنائے ہوئے اصولوں اور ضابطوں کا تجربہ کرنے سے گریز کرتا ہے اور انہیں اپنانے کے لیے اپنے اندر کوئی امنگ نہیں پاتا۔ بلکہ بار ہا ایسا ہوتا ہے کہ وہ ان سے برسرپیکار ہوتا ہے۔

ضرورت ہے کہ پہلے ہم خود سمجھیں، پھر نہایت یقین اور اعتماد کے ساتھ اپنے برادران وطن کو بتائیں کہ ہمارے دیش میں جتنا کچھ بحران اور جتنا کچھ خلفشار ہے، اور سارے ملک میں جو طبقاتی کشمکش برپا ہے، ان سب کا حل صرف اور صرف قرآن یعنی اللہ کا بھیجا ہوا قانون ہے، اگر وہ سچ مچ مادر وطن سے محبت رکھتے ہیں، تو ان کا فرض ہے کہ وہ اس نسخۂ کیمیا کو بھی آزمائیں۔

ہم انہیں جس طرح بھی ہو سکے یہ سمجھائیں کہ انسانوں کی اجتماعی زندگی ہو یا انفرادی، وہ کبھی کامیاب اور پرمسرت ہو ہی نہیں سکتی، جب تک اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے اصولوں کی پابند نہ ہو۔ انسان کا علم بہت تھوڑا اور محدود ہے۔ (وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلاً۔ سورۃ الاسراء:۸۵)

وہ خود اپنی نجی زندگی کے لیے کامیاب اصول وضع کرنے سے عاجز ہے۔ پھر وہ پورے انسانی سماج کے لیے صحیح اور راست قوانین کیونکر وضع کر سکے گا؟

ہم مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اپنے اہل وطن تک اللہ کا دین پہنچائیں، ہم ملک کے ایک ایک باشندے کے گھر کی کنڈی کھٹکھٹائیں اور اس کے دل کے دروازوں پر دستک دیں، اگر وطن عزیز کا کوئی ایک فرزند بھی اللہ کی ہدایت اور اللہ کی کتاب سے ناآشنا رہ جاتا ہے، تو یہ اپنے اہم ترین فرض کی ادائیگی میں ہماری ناکامی کا اعلان، اور ہماری خدا پرستی اور قرآن دوستی کے لیے ایک کھلا ہوا چیلنج ہے۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو ہمارا جرم کتنا سنگین، اور ہماری کوتاہی کتنی افسوسناک ہے۔ آج ملک کی کتنی فیصد آبادی ہے، جس تک ہم نے اللہ کا کلام اور اس کا پیغام پہنچایا ہے؟

یہ برادران وطن جن تک اللہ کا پیغام اور اللہ کا کلام پہنچانا ہمارا فرض ہے۔ اگر ان تک ہم رب کا پیغام نہیں پہنچاتے ہیں، اور وہ اسی ناواقفیت یا جاہلیت کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، تو کیا ان کی بے دینی اور خدا بیزاری کے ذمہ دار ہم نہیں قرار پائیں گے؟

اور اگر اس سلسلے میں ہم سے باز پرس ہوئی، اور یقیناً باز پرس ہوگی، تو اپنی صفائی یا گلوخلاصی کے لیے ہم کیا جواب دیں گے؟

برادران وطن کے سلسلے میں ہم سے کوتاہی ہو ہی رہی ہے، خود برادران اسلام کی اکثریت آج قرآن سے بے بہرہ ہے۔ آج ہندوستان کا مسلمان بھی قرآن کو کتاب ہدایت اور دستور حیات ماننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ قرآن کو محض برکت اور ثواب کی کتاب سمجھتا ہے اور اس کے حروف و الفاظ کی تلاوت کو کافی سمجھتا ہے۔

حروف والفاظ کی تلاوت کرنے والوں کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں، مسلمانوں میں ایک بھاری اکثریت ایسی ہے جو گھر کی کسی اونچی الماری میں خوبصورت ریشمی جزدانوں کے اندر قرآن پاک رکھے رہنے کو کافی سمجھتی ہے۔

قرآن پاک کی ایک آیت ہے:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِيْ اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُوراً۔ (سورة الفرقان:۳۰)

(اور رسول کہے گا اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو پس پشت ڈال دیا تھا۔)

یہ آیت یاد آتی ہے تو کلیجہ کانپنے لگتا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے یہ آیت ہماری ہی قرآن فراموشی یا قرآنی تعلیمات سے بے اعتنائی کا دردناک منظر پیش کر رہی ہو اور ہمارے سامنے ہمارے خلاف حجت بن کر کھڑی ہو!

مجموعی حیثیت سے آج ملت اسلامیہ قرآن پاک کو پس پشت ڈال چکی ہے۔ بلاشبہ آج حفظ و تجوید کے نیشنل اور انٹرنیشنل مقابلے ہو رہے ہیں۔ جگہ جگہ قرآنی مکاتب اور قرآنی مراکز کھولے جا رہے ہیں، ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں قرآن اور ترجمۂ قرآن کے نہایت دیدہ زیب نسخے چھپ رہے ہیں اور ملکوں ملکوں تقسیم ہو رہے ہیں، لیکن اصل بنیادی کام جس کے لیے قرآن پاک کا نزول ہوا تھا، وہ کام نہیں ہو رہا ہے۔

یہ قرآن آیا تھا تاکہ ہماری زندگیوں کو روشن کرے، وہ ہمیں زندگی کی اعلی قدروں سے روشناس کرائے۔ وہ ہمیں زندگی کا نہایت اعلی اور پاکیزہ نصب العین عطا کرے۔ وہ ہمیں اللہ کے لیے جینا اور اللہ کے لیے مرنا سکھائے۔ وہ بگڑی ہوئی گمراہ قوموں کی غلامی اور ہر چیز میں ان کی نقالی کرنے کے بجائے قوموں کی قیادت اور دنیا کی امامت کے آداب سکھائے۔

مگر آہ! ہم نے قرآن پاک کی اس حیثیت کو نہیں سمجھا، اپنی زندگی کے اہم پروگراموں سے



اسے دور رکھا۔ اپنی نجی یا سماجی زندگی کے اہم فیصلوں میں اسے شریک نہیں کیا، ہم نے اسے اپنی زندگی کی راج گدی پر بٹھانے کے بجائے اسے زندگی کی گیلری میں ڈال دیا۔ اور ایسا کر کے ہم نے قرآن کو نہیں، خود اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔

مسلمانو! صورت حال بڑی دردناک ہے، آج اگر ملک کے اندر مسلمان بے وقعت ہیں تو اس کا الزام حکومتوں کو مت دو۔ برادران وطن کو بھی مت دو۔ کیونکہ یہ خود اپنی بوئی ہوئی فصل ہے جو ہم کاٹ رہے ہیں۔

اللہ کی کتاب سے روگردانی، اور اس کی طرف سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں سے پہلوتہی ہی ہماری تمام پریشانیوں کی جڑ، اور ہماری تمام بربادیوں کی اصل ہے۔

اگر ہم اپنے مہربان رب کے یہاں عزت نہ حاصل کر سکے تو کون ہے جو ہمیں عزت کے ایوانوں میں جگہ دلا سکے۔ کون ہے جو ہمیں ذلت وخواری کے بحر ظلمات سے باہر نکال سکے!

ہوسکتا ہے اس موقع پر آپ ملک کے کرپشن اور حالات کی ناسازگاری کا شکوہ کریں، ملک کی انتہا پسند تنظیموں اور ان کی کھلی ہوئی زیادتیوں، بدعنوانیوں اور اینٹی (anti) اسلام اور اینٹی (anti) مسلم سرگرمیوں کا حوالہ دیں۔ قرآن سے انہیں جو دشمنی ہے۔ ملک کی عدالت عالیہ اور عدالت عظمیٰ کے ذریعے اس پر پابندی لگوانے کی جو کوششیں ماضی میں ہوئی ہیں اور آئے دن ہوتی رہتی ہیں، ان کا تذکرہ کریں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ساری باتیں کیا ہمارے لیے فرض میں کوتاہی کی دلیل بن سکتی ہیں؟
کیا یہ ساری باتیں فرض دعوت اور فرض تبلیغ سے ہمیں بری کر سکتی ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں!

نوائے حق کو اگر یہ دنیا قرار دیتی ہے باغیانہ
میں تہمتِ بزدلی نہ لوں گا مجھے گوارا ہے سر کٹانا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہ نے مکہ میں جب قرآن پاک کا پیغام سنایا تھا، اور جب مشرکین عرب کو قرآن پاک پر ایمان لانے کی دعوت دی تھی، تو کیا اس وقت کے حالات ان کے لیے سازگار تھے؟

کیا انہیں گالیوں، دھمکیوں، اور ہر قسم کی اذیتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا؟ یقیناً کرنا پڑا تھا اور ہم سے زیادہ کرنا پڑا تھا۔ لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ انؐ کے پائے استقلال میں ذرا بھی لرزش نہیں ہوئی۔

وہ سارے ظلم سہتے رہے اور آندھیوں میں چراغ جلاتے رہے۔ آندھیاں تھک گئیں، مگر وہ لوگ نہیں تھکے۔ بالآخر آندھیوں کا زور ٹوٹ گیا اور وہ چراغ آفتاب بن گیا اور اس کی لاہوتی کرنیں سارے عالم میں پھیل گئیں۔

یہ نامساعد حالات جن سے ہم گھبراتے ہیں، انہی نامساعد حالات میں دعوتیں پلتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ انہی نامساعد حالات میں قومیں سنبھلتی اور زندگی کے معرکے سر کرتی ہیں، انہی نامساعد حالات میں دعوتی کام کرنے والوں کی صلاحیتیں نکھرتی اور ان کی چھپی ہوئی عظمتیں سامنے آتی ہیں۔

حالات کے نامساعد ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم اپنی ڈھال ٹیک دیں اور اپنے فرائض سے دست کش ہو جائیں۔

حالات کے نامساعد ہونے کا مطلب صرف اور صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم پہلے سے زیادہ ہوشیار ہو جائیں، جہاں تک ممکن ہو، حکمت و دانائی سے کام لیں اور ایسی پالیسی اپنائیں اور ایسے پروگرام لے کر چلیں کہ ان حالات کے شر سے محفوظ رہتے ہوئے اپنے کام کو جاری رکھ سکیں۔

پھر سوچنے کا ایک پہلو اور بھی ہے، ہمارے اس ملک میں اگر اس وقت شر پسندوں کا دور دورہ ہے تو خیر پسندوں کی بھی کمی نہیں۔ اگر یہاں ایک بڑی تعداد ایسے عناصر کی ہے جو رات ودن اسلام اور اہل اسلام کے خلاف زہر اگلتے ہیں، تو ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو ان زہر افشانیوں کو ناپسند کرتے اور کھل کر ان کی مذمت کرتے ہیں۔

اگر مسلمانوں پر ظلم ہوتا ہے، چاہے اس ملک میں یا اس ملک کے باہر، تو اس کے خلاف وہ صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور بسا اوقات ان کے بیانات خود مسلم دانشوروں سے زیادہ جرأت مندانہ ہوتے ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

’’موجودہ عالمی حالات میں ایک ایسے لیڈر کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے جو جارج ڈبلیو بش کے سامنے کھڑا ہو سکے اور امریکی بالادستی کو چیلنج کر سکے۔ حالات کا تجزیہ بالخصوص جارج ڈبلیو بش کی پالیسیوں کا جائزہ صاف بتا رہا ہے کہ آج نہیں تو کل یہ ہو کر رہے گا‘‘۔ (نتیش مشرا، جنوبی چوبیس پرگنہ اسٹیٹس مین، 21 اکتوبر 2007)

’’آج ہر سمجھدار انسان امریکہ کی خارجہ پالیسی اور خاص طور پر عراق پالیسی کو بری نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ خیال کرنا کہ مٹھی بھر لوگ محض اپنی معاشی غرض کو سامنے رکھ کر جھوٹ کی بنیاد پر کسی ملک کے خلاف فوجی کارروائی کر بیٹھیں اور دنیا بت بنی دیکھتی رہے، تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد حنیف کے



قضیے نے تو یہ بالکل بے نقاب کر دیا کہ مغرب کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے، اس ایجنڈے میں سلمان رشدی جیسے لوگوں کی ہی گنجائش ہے۔ اگر آپ اسی گھٹیا ذہنیت کے ہیں تب تو ٹھیک ہیں، ورنہ دہشت گرد، دہشت گردی اس ورلڈ آرڈر کی پیداوار ہے جو چند بڑی طاقتیں قائم کرنا چاہتی ہیں۔ ورلڈ آرڈر میں کمزور قوموں اور کمزور ملکوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے‘‘۔ (سنجے گھوش، نئی دہلی، ڈیلی دی ہندو 24 جولائی 2007)

’’کیا یہ ایک بھونڈا مذاق نہیں ہے کہ جس ملک کی عدلیہ اس قدر چاق و چوبند ہو، وہاں لوگ برسوں کسی قانونی چارہ جوئی کے بغیر جیلوں میں پڑے سڑتے رہیں۔ بیشتر واقعات ایسے ہیں کہ ملزم کا جرم ثابت نہیں ہو سکا۔ کیا کبھی الزام لگانے والوں کو بھی سزا ملی؟ اگر نہیں، تو ایسا کیوں ہوا؟‘‘ (میجر جنرل (ریٹائرڈ) وی کے سنگھ گڑگاؤں، ہندوستان ٹائمز، یکم جون 2007)

’’تسلیمہ نسرین کو بنیاد پرست مسلمانوں سے خواہ کتنی ہی شکایتیں ہوں، انہیں ایک خاص مذہب کے ماننے والوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی اجازت کبھی کسی قیمت پر نہیں دی جاسکتی۔ وہ اس ملک کی شہری بھی نہیں ہیں، اس لیے وہ نہ تو کسی خاص مذہب کے ماننے والوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا حق رکھتی ہیں اور نہ ہی ملک کے سیکولر کردار کو مجروح کرنے کا‘‘۔ (ارون گپتا، کلکتہ، اسٹیٹس مین، 9 جنوری 2008)

’’اس میں اب کوئی شبہہ نہیں رہ گیا کہ حزب مخالف کے لیڈر لال کرشن اڈوانی عامر خان سے زیادہ اچھے اداکار ہیں۔ خبر ہے کہ وہ عامر خان کی فلم ’’تارے زمین پر‘‘ دیکھتے ہوئے رو پڑے تھے۔ (۱۳ جنوری) ان کی پارٹی انہیں لوہ پرش کہتی ہے۔ لیکن مسٹر اڈوانی نے یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ان کے مخالفین چاہے انہیں سخت گیر موقف کا حامل لیڈر کہیں، مگر ان کے سینے میں ایک ایسا دھڑکتا دل ہے جو سوز و گداز سے لبریز ہے۔ اس موقع پر وزارت عظمیٰ کے بی جے پی امیدوار سے یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ جب گجرات میں نریندر مودی حکومت کے اشارے پر معصوم بچوں کا قتل کیا جا رہا تھا، ان کے ماں باپ کا قتل کیا جا رہا تھا، اور پورا گجرات جل رہا تھا، تب ان کی آنکھیں کیوں خشک پڑی تھیں کہ ان سے ایک قطرہ آنسو نہ ٹپکا۔ ہاں یاد آیا کہ نریندر مودی نے بھی حال ہی میں کچھ آنسو بہائے ہیں۔ تو بھلا آقا کیوں پیچھے رہتا!‘‘ (مکیش کوشک، غازی آباد، ایشین ایج، 14 جنوری 2008)

’’حکومت ہند کو اپنے شہریوں کے حقوق کی حفاظت کرنی چاہیے، جو لوگ اس سے الگ سوچ رکھتے ہیں انہیں جان لینا چاہیے کہ آج جو کچھ ایک مسلمان کے ساتھ ہوا ہے، کل انہی حالات سے کسی

ہندو، سکھ یا عیسائی کو بھی دوچار ہونا پڑسکتا ہے۔'' (وی راما سوامی، نیوجرسی (امریکہ) دی ہندو، 19 جولائی 2007)

''اناپولیس میٹنگ اس مذاق کی کڑی ہے جو گزشتہ سو برس سے جاری ہے، کیونکہ اسرائیل مقامی آبادی کو بے دخل کرنے اور ان کی زمین پر ناجائز قبضے سے باز نہیں آئے گا، نسلی تطہیر اور قتل عام کا سلسلہ جاری رہے گا اور یوں امن کے عمل کو سبوتاژ کردے گا۔ اسرائیل اقوام متحدہ اور عالمی برادری کے اس مطالبے کو سنی ان سنی کرتا چلا آرہا ہے، مسئلہ فلسطین کا قابل قبول باوقار حل نکلنا چاہیے۔'' (دیپک جوشی، ممبئی، ہندوستان ٹائمز، 30 نومبر 2007)

یہ چند نمونے ہیں، ورنہ اس طرح کے بیانات جلی سرخیوں کے ساتھ برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بیانات اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ ہمارا ملک ہندوستان اس گئی گزری حالت میں بھی خیر پسند عناصر سے خالی نہیں ہے، اور کام کرنے والوں کے لیے کام کے بے شمار مواقع ہیں۔

جہاں تک قرآن پاک کا تعلق ہے، تو قرآن پاک کے لیے تو ہندو قوم میں بڑی پیاس پائی جاتی ہے، اتنی پیاس پائی جاتی ہے، جس کا ہم دور سے اندازہ نہیں کرسکتے۔

27 نومبر تا 7 دسمبر 2007ء میں لکھنؤ مہوتسو میں کتاب میلہ لگا۔ اس میلے میں مدھر سندیش سنگم نے بھی اپنا بک اسٹال لگایا۔ جس پر دیگر بہت سی کتابوں کے ساتھ ساتھ ہندی ترجمہ قرآن، انگریزی ترجمہ قرآن کا بہت بڑا اسٹاک تھا۔

رپورٹ کے مطابق ہزاروں ہندو اس بک اسٹال پر آئے اور ہزاروں کی تعداد میں ہندی ترجمہ قرآن خرید کر لے گئے۔ قرآن پاک کے مطالعہ کے بعد انہوں نے اپنے جو تأثرات واحساسات بیان کیے وہ انتہائی حیرتناک، انتہائی حوصلہ افزا، اور اس کتاب الٰہی کے بالکل شایان شان تھے۔ نمونے کے طور پر صرف دو تأثرات ملاحظہ ہوں:

''آج میرے من کی مراد پوری ہوگئی، میں بہت دنوں سے قرآن کا ہندی ترجمہ اور حضرت محمد صاحبؐ کی جیونی پڑھنا چاہتی تھی، مگر تلاش کے باوجود مل نہیں پارہی تھی، مدھر کے اسٹال سے یہ سب چیزیں پاکر میں مالامال ہوگئی۔ اس انمول تحفے کو میں زندگی بھر اپنے ساتھ رکھوں گی اور اس سے رہنمائی حاصل کرتی رہوں گی۔ شکریہ''۔ (شانتی ورما، لکھنؤ)

''جب میں نے قرآن کا مطالعہ شروع کیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا، زندگی کے بھید کھلتے گئے۔ اس کا ایک ایک لفظ انمول ہے۔ کاش آج کے مسلمان اس کو اپنی زندگی



میں اتارلیں''۔ (راکیش، پترکار، سہ روزہ دعوت 22 جنوری 2008)

قرآن پاک کے تعلق سے یہ دو ہندوؤں کے بیانات ہیں، ایک ہندو عورت کا بیان ہے اور دوسرا ہندو مرد کا۔ ان دونوں بیانات سے پہلے بھی اور ان کے بعد بھی مدھر سندیش سنگم کی طرف سے سہ روزہ دعوت، دہلی میں بہت سے بیانات شائع ہوتے رہے، جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

یہ بیانات ہماری اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ پوری ہندو قوم قرآن کی مخالف ہے۔ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہے بلاشبہہ ان کا ایک طبقہ مخالف ہے۔ مخالف ہی نہیں، بلکہ مخالفت میں بالکل اندھا ہے۔ لیکن ان کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے جس کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جو قرآن کی مخالف نہیں، بلکہ قرآن کے لیے پیاسی ہے۔ وہ اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لیے کتاب الٰہی کو ڈھونڈتی ہے اور اس کے لیے دردر کی ٹھوکریں کھاتی ہے۔ کچھ خوش نصیب ہوتے ہیں جن کی مراد برآتی ہے، مگر کتنے ہی ایسے ہوتے ہیں جو اس جستجو میں کامیاب نہیں ہوتے، اور یہ تڑپ دل میں لیے ہوئے اس جہان سے رخصت ہوجاتے ہیں، یا تھک ہار کر، مایوس ہوکر بیٹھ جاتے ہیں۔ آج اس ملک کی ہندو قوم بزبان حال اپنے رب سے یہ فریاد کررہی ہے:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دوچار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں!

شانتی ورما کے اس جملے سے سرسری طور سے نہ گزر جایئے۔ (میں بہت دنوں سے قرآن کا ہندی ترجمہ اور حضرت صاحبؐ کی جیونی پڑھنا چاہتی تھی۔ مگر تلاش کے باوجود مل نہیں پارہی تھی!)

اس ملک کے اندر یہ ہم مسلمانوں کا فرض تھا کہ ایک ایک باشندے کو قرآن کے ترجمے فراہم کرتے۔ اسے اس کی عظمت واہمیت سے آگاہ کرتے۔ اس کتاب کو پڑھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی اسے ترغیب دیتے اور اس معاملے میں اس کی مدد کرتے۔ مگر افسوس ہم نے ایسا نہیں کیا، ایسا نہ کرکے ہم نے خود بھی نقصان اٹھایا۔ اور اس قوم کو بھی اس عظیم نعمت سے محروم رکھا۔

شاید ہماری انہی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان میں ایک طبقہ ایسا پایا جاتا ہے جو قرآن کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس پر پابندی لگائے جانے کی باتیں کرتا ہے۔

ظاہر ہے، جب انہوں نے براہ راست قرآن کو پڑھا اور سمجھا نہیں، اور ہم نے بحیثیت قوم، سیرت وکردار کا کوئی اچھا نمونہ پیش نہیں کیا، تو کیا غلط کیا انہوں نے اگر ہماری ساری غلطیوں کو قرآن سے جوڑ دیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا، کہ یہ مسلمان جو کچھ کرتے ہیں، یہ ان کے قرآن کا ہی سکھایا ہوا سبق

ہے۔

اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی اس غلط فہمی کو دور کریں، ہم انہیں بتائیں کہ اگر ہمیں دیکھ کر تم نے قرآن پاک کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، تو یہ تمہاری غلطی ہے۔ بدقسمتی سے ہماری زندگیاں قرآن پاک کے مطابق نہیں ہیں، بلکہ اس سے دور بہت دور ہیں۔

اگر تمہیں قرآن پاک کے بارے میں جاننا ہے، تو خود قرآن کو پڑھو اور اگر کسی زندگی کے روپ میں اسے دیکھنا ہے تو حضرت محمدؐ کی سیرت پڑھو، آپ کے خاص ساتھیوں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی سیرت پڑھو، اور دوسرے بہت سے بزرگ صحابہ کی زندگیوں کو دیکھو۔

ان زندگیوں میں تمہیں قرآن پاک کی صحیح تصویر ملے گی۔ ان زندگیوں کو دیکھ کر تم سمجھ سکتے ہو، کہ قرآن پاک کیا ہے؟ وہ انسانوں سے کیا چاہتا ہے؟ وہ زندگیوں میں کیا انقلاب لانا چاہتا ہے؟ وہ انسانی زندگیوں کو کن بلندیوں تک لے جانا چاہتا ہے؟

ان زندگیوں کو دیکھ کر تمہیں اندازہ ہوگا کہ یہ کتاب الٰہی انسانوں کے لیے کتنی بڑی نعمت اور کتنی بڑی رحمت ہے اور اگر سارے انسان، یا انسانوں کی بڑی تعداد اس کو اچھی طرح سمجھ کر اختیار کر لے، تو یہ دنیا جو دن بدن جہنم بنتی جا رہی ہے، دیکھتے دیکھتے نعمتوں اور راحتوں سے بھری ہوئی جنت میں تبدیل ہو جائے، کسی ایک قوم یا ایک نسل یا ایک طبقہ کے لیے نہیں، بلکہ سارے انسانوں اور سارے جانداروں کے لیے۔ سارے انسانوں اور سارے جانداروں کے لیے یہ ایک پر کیف جنت بن جائے۔

مسلمانو! آج اگر ہندوستان میں قرآن کے خلاف آوازیں اٹھتی ہیں، یا اگر ماضی میں اٹھی ہیں تو اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ہم نے صحیح ڈھنگ سے قرآن پاک کا تعارف نہیں کرایا۔ ہم نے بہت سی قرآنی آیات کی تاویل وتفسیر میں کچھ ایسی باتیں کہیں جو قلتِ غور وفکر کا نتیجہ تھیں۔ ان کے دوررس نتائج پر غور نہیں کیا۔ آج وہی باتیں دشمنان اسلام کے ہاتھوں میں قرآن اور اسلام کے خلاف سب سے بڑا ہتھیار بن گئیں۔

جہاد قرآن کی نہایت اہم اور مقدس اصطلاح ہے۔ اس اصطلاح کا ہم نے موقع بے موقع استعمال کیا۔ جس سے قرآن کی کوئی اچھی تصویر سامنے نہیں آئی۔ حالانکہ جہاد کا قرآن میں جو تصور ہے وہ انتہائی دلآویز اور انتہائی بلند ہے جو دوست تو دوست دشمنوں کو بھی اس کا گرویدہ بنا دے۔

آج کل اسلامی جہاد کی جو تصویر غیر مسلموں کے ذہن میں ہے، وہ دہشت گردی سے ملتی جلتی



ہے، جب کہ جہاد اور دہشت گردی میں وہی فرق ہے، جو فرق خوشبو اور بدبو میں ہے۔ یا آبِ شیریں اور تیزاب میں ہے، یا روشنی اور تاریکی میں ہے۔

جہاد دنیا کے لیے رحمت ہے، دہشت گردی ایک عذاب ہے۔

جہاد دنیا سے ظلم و ناانصافی اور وحشت و بربریت کو ختم کرنے کی ایک مبارک کوشش ہے، دہشت گردی ظلم و بربریت ہی کا دوسرا نام ہے۔

جہاد ہر انسان کی فطری آزادی کو باقی رکھنے اور اسے عزت کی پوشاک پہنانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جانے کا نام ہے۔ جبکہ دہشت گردی کمزوروں کو ہر قسم کے حقوق سے محروم کر دینے، ان کی رگوں کا خون چوس لینے اور ان کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں پر اپنی حکومت کا تخت بچھانے کا نام ہے۔

جہاد نوع انسانی کی دنیا وآخرت سنوارنے کے لیے اپنے آپ کو مٹا دینے اور قربان کر دینے کا نام ہے، جب کہ دہشت گردی وسائل رزق و دولت پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے لیے انسانی بستیوں کو اجاڑ دینے کا نام ہے۔

جہاد اس زمین پر صرف اور صرف اللہ کے لیے جینے کا نام ہے، جب کہ دہشت گردی شیطانی خواہشات اور شیطانی منصوبوں کے لیے جینے کا نام ہے۔

ہمارے پیارے نبیؐ مجاہدوں کے سردار تھے، مگر رأفت و رحمت کا پیکر تھے۔ پیار و محبت کا دریا تھے، اپنے پرائے سب کے غم خوار تھے اور بھٹکے ہوئے انسانوں کو راہ راست پر لانے کی فکر میں گھلے جاتے تھے۔

ضروری ہے قرآنی اصطلاحات کے سلسلے میں غیر مسلموں کی جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور کی جائیں اور قرآنی تعلیمات کا روشن پہلو ان کے سامنے لایا جائے۔

یہ بات ہمارے ذہن میں واضح رہے کہ اگر کہیں قرآن سے نفرت یا بغاوت پائی جاتی ہے۔ تو وہ حقیقت میں قرآن سے نفرت اور بغاوت نہیں، بلکہ مسلمانوں کی نئی یا پرانی نسلوں کے طرز عمل سے نفرت اور بغاوت ہے، اس نفرت کا علاج ان سے نفرت نہیں ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ ہم اپنی کوتاہیوں کا ادراک کریں۔ سچے دل سے ان کا اعتراف کریں، اور جس حد تک ممکن ہو، ان کی تلافی کی کوشش کریں۔

اگر کوئی دشمن اسلام نادانی میں قرآن کے ساتھ کوئی بے ادبی یا گستاخی کرتا ہے، تو اس پر مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ نہایت دل سوزی اور دردمندی کے ساتھ اسے سمجھانے کی ضرورت ہے۔

اس طرح کے مواقع پر اگر کوئی جوابی تحریر شائع کی جائے، کوئی اداریہ یا کوئی کالم لکھا جائے، تو اس میں طنز و تعریض، غیظ و غضب یا مناظرے کا نہیں، نصح و خیر خواہی اور محبت کا انداز ہو، بالکل وہی انداز جو کسی مخلص اور دردمند ڈاکٹر کا اپنے نادان مریض کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

اور اگر ممکن ہو تو میڈیا میں اسے موضوع بحث بنانے کے بجائے متعلق شخص یا متعلق پارٹی سے براہ راست ملاقات کر کے اس کی غلط فہمی دور کرنے اور حکمت سے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس طرح کے مواقع پر جذباتیت سے کام لینا اور تشدد کا طریقہ اختیار کرنا کبھی سودمند نہیں ہوتا، بلکہ اس سے کتاب الٰہی کی مزید بے حرمتی ہوتی ہے اور دشمنوں کی ضد اور شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

نزول قرآن کے زمانے میں بھی قرآن پاک کا مذاق اڑایا گیا، خوب خوب اڑایا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مذاق اڑایا گیا، جس کی تفصیلات خود قرآن پاک میں موجود ہیں۔ لیکن اس پر کبھی مسلمانوں کو یا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو طیش نہیں آیا۔

تبلیغ قرآن اور دعوت اسلام کے سلسلے میں قرآن پاک کی بہت ہی اہم ہدایت ہے:

ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ۔ (سورۃ فصلت: ۳۴)

(برائی اور بدتمیزی کا علاج ہمیشہ حسن اخلاق سے کرو۔ یکایک دیکھو گے کہ جو تمہارا دشمن تھا، وہ تمہارا جگری دوست ہو گیا)

ضرورت ہے کہ ہم قرآن پاک کے سلسلے میں صبر و تحمل اور حکمت و دانائی سے کام لیں اور دنیا کے سامنے اس طرح اس کا تعارف کرائیں کہ وہ دنیا والوں کی سب سے محبوب کتاب بن جائے۔

پھر اگر ہم اس کتاب کو دنیا والوں کی سب سے محبوب کتاب بنانے کے آرزو مند ہیں، تو اس سے پہلے ضروری ہے کہ یہ خود ہماری سب سے محبوب کتاب بن جائے۔ خالی زبانی دعوت جس کے ساتھ کردار کی تائید اور کردار کی تصدیق نہ ہو، وہ ایک بے معنی سی آواز ہوتی ہے۔ وہ دعوت جو خود داعی کو متاثر نہ کر سکی ہو، وہ کسی دوسرے کو کیا متاثر کرے گی؟

اپنی دعوت کا اولین مخاطب خود اپنی ذات اور اپنے خاندان کو بنائیے، دوسرے نمبر پر دوسروں کو بنائیے۔

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو
پیکر عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا



برادران اسلام! جب ہم کسی دوسرے کو قرآن کی دعوت یا قرآن کا ہدیہ پیش کرتے ہیں تو گویا یہ کہتے ہیں کہ ہم نے خود اس کتاب کو اچھی طرح پڑھا اور سمجھا ہے۔ اس کے بتائے ہوئے اصولوں کا تجربہ کیا ہے۔

تجربہ کی بنیاد پر ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ کتاب ہمارے قلب و روح کے لیے آب حیات ہے۔ ہماری تمام معاشرتی اور سماجی بیماریوں کے لیے نسخۂ شفا ہے۔ اب یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک قیمتی نسخہ شفا ہمارے پاس موجود ہو، اور اس سے ہم اپنے اہل وطن کو فائدہ نہ پہنچائیں۔

پھر قرآن کی دعوت پیش کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جن کے سامنے ہم قرآن کی دعوت پیش کر رہے ہوں، ان کے اور ہمارے درمیان کامل اعتماد اور بے لوث محبت کی فضا پائی جائے۔

یہ اعتماد و محبت کی فضا اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے، جب ہم دردمندی و دل سوزی اور حسن کردار کے اس مقام پر ہوں کہ قوم سے بے تکلف کہہ سکیں میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں (انی لکم ناصح امین)۔ اور جب یہ بات آپ قوم سے کہیں تو چاہے زبانیں خاموش ہوں، مگر ان کے دل یہ گواہی دے رہے ہوں کہ آپ واقعی ان کے خیر خواہ ہیں۔

برادران اسلام! آپ اس بات کو کبھی نہ بھولیے کہ اس ملک میں آپ کی اصل حیثیت ایک داعی حق اور ایک معلم قرآن کی ہے۔ آپ کو اس ملک میں دعوت دین اور تعلیم قرآن کے لیے جینا ہے۔ آپ کو اس ملک میں وہ کام کرنا ہے، جو کام ہمارے اور آپ کے نبی نے جزیرۂ عرب میں کیا تھا۔ اور یہ کام اسی وقت انجام پا سکتا ہے، جب اس کام کے لیے ہمارے اندر تڑپ ہو۔ وہی تڑپ ہو جو ہمارے ہادی و رہ نما حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر پائی جاتی تھی۔

طائف میں مقدس خوں ٹپکا، مکے میں کبھی پتھر کھائے
بس ایک تڑپ تھی، کیسی تڑپ انسان ہدایت پا جائے

ضروری ہے کہ ہمیں اپنے اہل وطن سے محبت و ہمدردی ہو۔ ان کے لیے ہمارے اندر دردمندی و دل سوزی ہو۔ انہیں راہ راست پر لانے کے لیے فکرمندی ہو۔ ہمارے اور ان کے درمیان کبھی حریفانہ کشمکش نہ ہو۔

وہ اگر ہمارے ساتھ کوئی زیادتی بھی کریں، تو ان کے خلاف ہمارے اندر کوئی انتقامی جذبہ نہ ہو۔
دعوت دین کا کام ہمیشہ بے لوثی اور بے نفسی چاہتا ہے۔ سید قطب شہیدؒ نے کسی موقع پر فرمایا تھا:

(ہم اسلام کی طرف صرف اس لیے بلاتے ہیں کہ ہمیں لوگوں سے محبت ہے، ہم ان کے لیے خیر و

فلاح کے آرزومند ہیں اور ہم یہ کام کرتے رہیں گے۔ اگرچہ وہ ستائیں اور ہر طرح کی اذیتیں پہنچائیں کہ ایک داعی اسلام کا یہی مزاج ہوا کرتا ہے، اس کے جذبات واحساسات کی یہی کیفیت ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کا بھی مخلص اور غمخوار ہوا کرتا ہے۔ وہ ان کی ہدایت کے لیے بے چین اور ان کی گمرہی سے دل فگار ہوتا ہے۔)

سید قطبؒ کے ہی ایک پیش رو ہم سفر تھے، یوسف طلعتؒ۔ یہ بھی اخوان المسلمون کے رہنماؤں میں سے تھے۔ برسوں مصر کی جیل میں رہے اور لرزہ خیز مظالم کا تختہ مشق بنے رہے، بالآخر وہاں کی بے رحم اور دشمن اسلام فوجی عدالت نے ان کو پھانسی کا فیصلہ سنادیا۔

پھانسی کے لیے جب ان کو لے جایا جانے لگا تو ایمان ویقین اور سوز محبت کی ان بلند فضاؤں میں وہ محو پرواز تھے کہ ساری انسانی عظمتیں ان کے پیروں میں آگئی تھیں، اس وقت وہ اپنے رب سے ہم کلام تھے اور زبان پر یہ الفاظ تھے:

اللھم اغفرلی ولمن عذبونی

"خدایا! تو مجھے بھی معاف کردے اور انہیں بھی معاف کردے جنہوں نے مجھے ظلم کی چکی میں پیسا"!

اللہ اللہ! کتنا بڑا دل، اور کتنا وسیع ظرف تھا کہ اس میں آسمان بھی سما جائے۔ مگر یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ایک سچے داعی حق کا یہی دل اور یہی جگر ہوا کرتا ہے!

معزز ساتھیو! دعوت دین اور تعلیم قرآن کا کام اسی طرح کی بے نفسی اور بے لوثی چاہتا ہے۔ اہل وطن کے دلوں کو حسن اخلاق اور سوز محبت سے جیتنے کی کوشش کیجئے۔ محبت اور حسن اخلاق کا تیر کبھی خطا نہیں کرتا، یہ وہ تیر ہے، جو انسان تو انسان، چٹانوں کے جگر میں سوراخ کردیتا ہے۔ دنیا میں اسلام تلواروں کی نوک سے نہیں پھیلا، ہمارے بزرگوں کے حسن اخلاق اور ان کی دل سوزیوں سے پھیلا۔ آج بھی اگر ہم قرآن پاک کے پیغام کو عام کرنا چاہتے ہیں، تو اس کے لیے یہی سوز محبت، یہی وسعت ظرف اور یہی عظمتِ کردار درکار ہے۔